ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.2 (2026)
(April to June)

ناول جندر میں مٹتے تہذیبی نقوش کی بازیافت: ایک تجزیاتی مطالعہ

Recovering Vanishing Cultural Imprints in the Novel Jandar: An Analytical Study

مہرین جہانگیر
لیکچرار اُردو، شعبہ اُردو، گورنمنٹ صادق کالج وومن یونی ورسٹی، بہاول پور
فردوس بی بی
بی۔ایس اُردو، گورنمنٹ صادق کالج وومن یونی ورسٹی، بہاول پور

Mehreen Jahangeer
Lecturer, Department of Urdu, Government Sadiq College Women University, Bahawalpur
Firdous Bibi
BS Urdu, Department of Urdu, Government Sadiq College Women University, Bahawalpur

Article Details
Received:
May 26, 2026
Accepted:
June 10, 2026
Online Published:
June 30, 2026

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: The novel Jandar occupies a distinguished position in Urdu fiction as it is not merely a literary narrative but also a significant repository of cultural consciousness, civilizational identity, and collective memory. This paper, entitled "The Recovery of Vanishing Cultural Imprints in the Novel Jandar: An Analytical Study", aims to examine the cultural, social, and civilizational elements embedded in the novel that are gradually disappearing under the influence of modernity, globalization, urbanization, materialism, and rapidly changing social values. The study explores how the novelist, through artistic and intellectual insight, preserves rural culture, family structures, folk traditions, customs, language, patterns of living, social values, and human relationships, thereby constructing a compelling narrative of cultural recovery. The research adopts an analytical and interpretative methodology to investigate the cultural symbols, social practices, and civilizational references woven into the text.

Key words: Jandar, culture, civilization, cultural heritage, cultural identity, folk traditions, rural society, Urdu novel

اختر رضا سلیمی معاصر اُردو ادب کے اُن ممتاز ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے مقامی تہذیب، ثقافت، تاریخ اور انسانی نفسیات کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ ان کا تعلق ایبٹ آباد کے علاقے کیکوٹ سے ہے، جہاں کا خاندانی اور تہذیبی پس منظر ان کی شخصیت اور تخلیقی شعور کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائی طور پر انہوں نے شاعری، کہانی اور مضامین نگاری سے ادبی سفر کا آغاز کیا، لیکن بعد ازاں ناول نگاری کو اظہار کا مؤثر وسیلہ بنایا۔ ان کے نزدیک ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں تہذیبی و ثقافتی زندگی کی مکمل تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے ان کے ناول "جاگے ہیں خواب میں"، "جندر" اور

"لواخ "اُردو ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے فکشن میں دیہی معاشرت، مقامی روایات، انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں اور تاریخی شعور نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ افتخار عارف نے ان کے ناول "جندر "کے بارے میں لکھا ہے:

"ہر بڑا ناول اپنے پڑھنے والے کو سرشار رکھتا ہے، اختر رضا سلیمی کے اس
ناول نے مجھے بہت دیر تک اس کیفیت میں رکھا۔" (۱)

اختر رضا سلیمی نہ صرف ایک کامیاب ناول نگار بلکہ شاعر، مدیر اور اُردو زبان کے فروغ کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے وابستہ ادیب بھی ہیں۔ ان کے ادبی سفر کو متعدد قومی اعزازات سے نوازا گیا، جبکہ ان کا ناول "جندر "ملکی و غیر ملکی جامعات کے نصاب کا حصہ بھی بن چکا ہے، جو ان کی تخلیقی اہمیت کا ثبوت ہے۔ ان کی تحریروں میں تہذیبی شناخت، ثقافتی شعور اور انسانی تجربات اس انداز سے یکجا ہوتے ہیں کہ قاری ماضی اور حال کے درمیان ایک مضبوط ربط محسوس کرتا ہے۔ ان کے تخلیقی مقام کے اعتراف میں مستنصر حسین تارڑ نے "جاگے ہیں خواب میں "کے بارے میں لکھا:

"اختر رضا سلیمی کا ناول 'جاگے ہیں خواب میں 'ناول کے فن میں ایک حیرت انگیز
جست ہے، ہمیں اس کی آمد پر کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ "(۲)

یہی خصوصیات اختر رضا سلیمی کو عصرِ حاضر کے اہم اور منفرد فکشن نگاروں میں ممتاز کرتی ہیں۔ ناول جدید نثری ادب کی ایک اہم اور ہمہ گیر صنف ہے جس کی موجودہ ترقی یافتہ صورت مغربی ادب سے مستعار ہے، تاہم اس کی جڑیں قدیم قصہ گوئی، داستان اور حکایتی روایت میں پیوست ہیں۔ ابتدا میں مافوق الفطرت قصے، رزمیہ داستانیں اور اخلاقی حکایات اس روایت کا حصہ تھیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، سیاست اور سماجی علوم نے ناول کے موضوعات اور اسلوب کو وسعت عطا کی۔ اطالوی لفظ "ناویلا "سے ماخوذ ناول انسانی زندگی، معاشرت، جذبات اور تہذیبی شعور کی عکاسی کرنے والی صنف ہے۔ اسی لیے ایملی زولا کے مطابق:

"ناول خیالاتِ انسانی کا تجزیہ ہے اور ان کے مظاہر کا ایک ریکارڈ۔ " (۳)

اسی طرح آل احمد سرور ناول کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قصہ گوئی انسانیت کی ابتدا سے ملتی ہے مگر ناول مہذب انسانوں کی ایجاد
ہے۔ "(۴)

ناول کی فنی تشکیل میں مرکزی خیال، پلاٹ، کردار، ماحول، مکالمہ، اسلوب، منظر نگاری، جذبات نگاری اور مقصد بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے ذریعے ناول نگار زندگی کی حقیقی اور متحرک تصویر پیش کرتا ہے۔ ورجینیا وولف کے الفاظ میں :

"ناول انسانوں کے متعلق لکھے گئے ہیں، اس لیے وہ ہمارے اندر ایسے احساسات
ابھارتے ہیں جیسا کہ انسان حقیقی زندگی میں ابھارتے ہیں۔"(۵)

اُردو ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی میں ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے، جنہوں نے اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی تربیت اور اسلامی اقدار کو اپنے ناولوں کا بنیادی موضوع بنایا۔ ان کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار نے معاشرتی زندگی، عبدالحلیم شرر نے تاریخی شعور، مرزا ہادی رسوا نے لکھنوی تہذیب، پریم چند نے دیہی اور سماجی حقیقت نگاری، قرۃ العین حیدر نے تہذیبی ارتقا، بانو قدسیہ نے فکری و روحانی مسائل، انتظار حسین نے ہجرت اور تہذیبی زوال، جبکہ مستنصر حسین تارڑ، مشرف عالم ذوقی اور اختر رضا

سلیمی نے عصر حاضر کے تہذیبی، ثقافتی اور سماجی مسائل کو ناول کا موضوع بنایا۔ اس ارتقائی سفر میں اُردو ناول نے مقصدیت، حقیقت نگاری، نفسیات، علامت نگاری، شعور کی رو، تاریخی شعور اور تہذیبی آگہی جیسے متنوع فنی و فکری رجحانات کو اپنے اندر سمو لیا۔ چنانچہ اُردو ناول محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ برصغیر کی سماجی، ثقافتی، تاریخی اور فکری زندگی کی ایک مستند دستاویز بن چکا ہے، جو ہر دور کے انسانی تجربات اور بدلتے ہوئے معاشرتی رویوں کو مؤثر انداز میں محفوظ کرتا ہے۔ اُردو ناول نے مقصدیت، حقیقت نگاری، نفسیات، علامت نگاری، شعور کی رو، تاریخی شعور اور تہذیبی آگہی جیسے متنوع فنی و فکری رجحانات کو اپنے اندر سمو لیا۔ چنانچہ اُردو ناول محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ برصغیر کی سماجی، ثقافتی، تاریخی اور فکری زندگی کی ایک مستند دستاویز بن چکا ہے، جو ہر دور کے انسانی تجربات اور بدلتے ہوئے معاشرتی رویوں کو مؤثر انداز میں محفوظ کرتا ہے۔ یہ روایت آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے اور عصرِ حاضر کے ناول نگار اپنے عہد کے تہذیبی، سماجی اور ثقافتی مسائل کو تخلیقی انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ انہی اہم معاصر ناول نگاروں میں اختر رضا سلیمی کا نام نمایاں ہے، جنہوں نے اپنے ناولوں، خصوصاً "جندر"، "جاگے ہیں خواب میں" اور "لوخ" کے ذریعے مقامی تہذیب، ثقافت، دیہی زندگی اور بدلتے ہوئے سماجی رویوں کو فنی مہارت کے ساتھ پیش کر کے اُردو ناول نگاری کی روایت کو مزید وسعت اور معنویت عطا کی ہے۔

اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" ایک ایسی تخلیق ہے جس میں دیہی تہذیب، مقامی ثقافت اور اجتماعی زندگی کے نقوش نہایت فنی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ناول میں "جندر" محض آٹا پیسنے کی چکی نہیں بلکہ ایک ایسی تہذیبی علامت ہے جو مقامی معاشرے کی محنت، باہمی تعاون، معاشی سرگرمیوں اور خاندانی روایات کی نمائندگی کرتی ہے۔ مصنف نے جندر کے ذریعے اس تہذیب کی تصویر کشی کی ہے جو جدید مشینی دور کے باعث آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو رہی ہے۔ مرکزی کردار ولی خان جندر کو اپنے آباؤ اجداد کی میراث اور اپنی تہذیبی شناخت تصور کرتا ہے، اس لیے جندر کی خاموشی اس کے نزدیک صرف ایک مشین کی بندش نہیں بلکہ پوری تہذیب کے خاتمے کی علامت ہے۔ اس تناظر میں ناول قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ جب تہذیبی روایات اور ان کی علامتیں معدوم ہوتی ہیں تو ایک قوم کی شناخت بھی متاثر ہوتی ہے۔ مصنف نے ناول میں واضح کیا ہے کہ جندر صرف ایک ذریعۂ معاش نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی ادارہ تھا، جس کے ساتھ لوگوں کی یادیں، روایات، اقدار اور اجتماعی شعور وابستہ تھے۔ ولی خان کے دادا محمد خان اور ان کے بڑے بھائی احمد خان کی تعمیر کردہ جندر اس خاندانی اور تہذیبی تسلسل کی علامت ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ جدید ٹیکنالوجی نے اگرچہ جندر کی عملی ضرورت کو ختم کر دیا، لیکن اس کے ساتھ ایک پوری دیہی تہذیب بھی معدوم ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں جندر کو ایک زندہ تہذیبی استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کی ادبی اہمیت کے بارے میں مسعود الشعر لکھتے ہیں:

> "جندر بہت عمدہ ناول ہے اس کے ذریعے اختر رضا سلیمی نے اُردو فکشن میں ایک نئے علاقے کو دریافت کیا ہے۔"(۶)

ناول میں جندر وئی تہذیب کے آغاز کو ایک لوک روایت کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں عورتیں گھروں میں ہاتھ کی چکی سے گندم پیستی تھیں، لیکن حالات نے انسان کو نئی ایجاد کی طرف راغب کیا اور پانی سے چلنے والی جندر وجود میں آئی۔ یہ ایجاد صرف ایک فنی کامیابی نہیں تھی بلکہ اس نے مقامی تہذیب، معاشرت اور روزمرہ زندگی میں ایک نئی جہت پیدا کی۔ جندر کے گرد لوگوں کے میل جول، تعاون اور باہمی انحصار نے ایک مضبوط سماجی اور تہذیبی نظام تشکیل دیا۔ اس عمل کی منظر کشی کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

"اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے پتھر کا ایک بڑا کھارا ترشا ہو گا اور پاٹوں کے پیچھے ایک اونچا تھلا بنا کر، اسے اس کے اوپر نصب کر دیا ہو گا پھر اس کے وسط میں سوراخ کر کے، لکڑی کی نالی کے ذریعے اسے ان پاٹوں کے وسط میں بنائے سوراخ سے یوں ملا دیا ہو گا کہ اگر کھارے میں دانے انڈیلے جائیں تو وہ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے پاٹوں کے درمیان گرنے لگیں۔ یہ سب کر چکنے کے بعد جب اس نے پانی موڑ کر پرنالے کے ذریعے جندر میں گرایا ہو گا اور وادی پہلی دفعہ جندر کی کوک سے آشنا ہوئی ہو گی تو جندر روئی تہذیب کا آغاز ہوا ہو گا۔"(۷)

اختر رضا سلیمی نے ناول "جندر "میں اپنے علاقے کی تہذیب، معاشرت، رسم و رواج اور سماجی اقدار کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول میں صرف جندر یا اس سے وابستہ افراد کی زندگی بیان نہیں کی گئی بلکہ اس کے ذریعے ایک ایسے دیہی معاشرے کی تصویر سامنے آتی ہے۔ جہاں طبقاتی تقسیم، خاندانی برتری، خوراک، داستان گوئی، خواتین کا مقام، تعلیم، رسوم و رواج اور اجتماعی طرزِ زندگی تہذیب کا لازمی حصہ ہیں۔ مصنف ان روایات کو محض بیان نہیں کرتا بلکہ ان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ناول میں طبقاتی تقسیم کو ایک اہم تہذیبی روایت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ معاشرے میں خاندانوں کی بنیاد پر عزت و مرتبہ متعین کیا جاتا ہے اور نچلے طبقے کے لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ان کے لیے الگ نشست، الگ کھانا اور کمتر رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح مصنف یہ واضح کرتا ہے کہ بعض اوقات تہذیب کے نام پر معاشرتی ناانصافیاں بھی نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے ناول میں بیان کیا گیا ہے:

"شام ڈھلے جب یہ قافلہ جندر کے پاٹوں کی جوڑی لے کر واپس پہنچا تو ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ ان کے لیے دیسی گھی میں طرح طرح کے کھانے پکائے گئے اور خصوصی مٹھائی بھی تیار کی گئی۔ جب کھانے کے میز پر بیٹھنے کی باری آئی تو انھوں نے دونوں بھائیوں کو کھانے کے بڑے کمرے میں بٹھانے کے بجائے باہر برآمدے میں بٹھایا؛ اور خصوصی طور پر پکائے گئے کھانے کے بجائے انھیں لسی میں پکا ہوا سرسوں کا ساگ اور مکئی کی چند روٹیاں دی گئیں۔ انھوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور وہاں سے نکل آئے۔"(۸)

یہ اقتباس اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ طبقاتی تفریق اس معاشرے کی تہذیبی ساخت کا حصہ بن چکی تھی۔ ناول میں مقامی خوراک بھی تہذیبی شناخت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ دیسی مرغ، دیسی گھی، مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ صرف غذائیں نہیں بلکہ اس علاقے کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مصنف ان غذائی روایات کے ذریعے دیہی زندگی کی سادگی، خود کفالت اور فطری ماحول کو اجاگر کرتا ہے۔

"صبح جب مائی خیراں کے گھر سے لائے ہوئے دیسی مرغوں نے بانگیں دینا شروع کیں تو دونوں بھائیوں نے اٹھ کر مرغ ذبح کیے؛ انھیں دیسی گھی میں اچھی طرح سے تلا اور اپنا اپنا مرغا چٹ کر کے گھی کو مٹی کے کوزے میں ڈال کر باری

باری گھونٹ بھرنے لگے۔ نیم گرم گھی پی کر انھوں نے اپنی بھاری پگڑیاں سر پر لپیٹیں اور راجا کے جندر کی طرف روانہ ہو گئے۔"(۹)

ناول میں لوک داستانوں کی روایت بھی دیہی تہذیب کا ایک اہم جزو ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ سے پہلے داستان گو معاشرے کی اجتماعی یادداشت اور تفریح کا اہم ذریعہ تھا۔ بابا جمال دین اسی روایت کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی کہانیوں کے ذریعے لوگوں کو نہ صرف محظوظ کرتا ہے بلکہ ان کے تہذیبی شعور کو بھی زندہ رکھتا ہے۔

"ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ بہت اچھا داستان گو تھا۔ اور جہاں بیٹھتا لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور کہانیاں سنتے۔ اسے بلا مبالغہ سینکڑوں کہانیاں یاد تھیں۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے لوک داستانوں اور کہانیوں میں ردوبدل کر کے انھیں اور بھی دلچسپ بنا دیا کرتا تھا۔"　　(۱۰)

مصنف نے خواتین کے سماجی مقام کو بھی تہذیبی تناظر میں پیش کیا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں عورت کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا تھا اور مرد کی دوسری شادی کو معاشرتی طور پر جائز سمجھا جاتا تھا۔ یہ رویہ اس معاشرے کی پدرشاہی اقدار کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں عورت کی اہمیت کو صرف ماں بننے سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔

"شادی کے بعد پانچ سال تک ہماری ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ نے مجھے بتایا تھا اور جب ہماری شادی کو دو سال گزر چکے اور تمھاری دادی کو پوتے پوتی کی خوش خبری نہ مل سکی تو اس نے میری دوسری شادی کرنے کی کوشش کا آغاز کر دیا۔"(۱۱)

اسی طرح سوتن کے خوف نے عورت کی نفسیاتی کیفیت کو بھی متاثر کیا، جس کی تصویر مصنف نے نہایت مؤثر انداز میں پیش کی ہے۔

"جب میری ماں کا اصرار حد سے بڑھنے لگا تو تمھاری ماں کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا کہ اماں اس پر سوتن لا کر ہی چھوڑ گئی۔ اس خوف نے اس کے شاداب چہرے پر اپنی پیلاہٹ بکھیرنا شروع کر دی۔ جوں جوں میری ماں کا اصرار بڑھتا گیا تمھاری ماں کھوئی سی رہنے لگی۔ یہاں تک اس کا شاداب چہرہ کاہو کے زرد پتے کی طرح ہو گیا۔"(۱۲)

ناول میں خواتین کی تعلیم کے بارے میں بھی اس دور کی تہذیبی سوچ نمایاں ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم دلوانا معیوب سمجھا جاتا تھا اور انہیں عموماً ابتدائی تعلیم کے بعد گھر بٹھا دیا جاتا تھا۔ مصنف اس روایت کو تنقیدی انداز میں بیان کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ وقت کے ساتھ یہ سوچ تبدیل ہو رہی ہے۔

"وہ ہمارے گاؤں کی پہلی میٹرک پاس لڑکی تھی۔ ان دونوں ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا؛ جو لوگ تھوڑے باشعور تھے وہ بھی بہ مشکل پرائمری تک ہی بچیوں کو تعلیم دالوتے تھے کہ لڑکیوں کا ہائی سکول ان دنوں صرف بڑے قصبے میں تھا جو یہاں سے سات میل دور تھا۔ قریبی گاؤں میں

صرف لڑکوں کا ہائی سکول تھا۔ اور لوگ مخلوط تعلیم کے حق میں نہیں تھے لیکن چچا، چوں کہ خود اسی ہائی سکول کے چپڑاسی تھے لہذا جب اس نے مزید پڑھنے کی ضد کی اور بابا جمال دین نے بھی اس کی تائید کی تو وہ راضی ہوگئے اور وہ پورے سکول میں واحد لڑکی تھی۔"(۱۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کے میدان میں تبدیلی کا آغاز اگرچہ محدود تھا، لیکن یہی تبدیلی بعد میں تہذیبی ارتقا کا سبب بنی۔ ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ "جندر" صرف ایک فرد یا ایک خاندان کی کہانی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی دستاویز ہے۔ مصنف نے طبقاتی تقسیم، خوراک، لوک ادب، خواتین کی سماجی حیثیت اور تعلیم جیسے موضوعات کو نہایت فطری انداز میں پیش کرتے ہوئے اس معاشرے کی تہذیبی ساخت کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہی خصوصیت اس ناول کو اُردو ادب میں تہذیبی شعور کی نمائندہ تخلیق بناتی ہے۔ ناول "جندر" میں دیہی تہذیب کا سب سے نمایاں پہلو اجتماعی زندگی اور باہمی تعاون کا نظام ہے۔ مصنف نے اس معاشرتی ڈھانچے کو محض ایک رسم کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی تہذیبی روایت کے طور پر پیش کیا ہے جس نے صدیوں تک دیہی معاشرے کو متحد رکھا۔ گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی، فصلوں کی کٹائی، مکانات کی تعمیر، خوشی اور غم کے مواقع پر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس اجتماعی نظام کو ناول میں "لیتری" کا نام دیا گیا ہے، جو باہمی اخوت، تعاون اور ذمہ داری کی بہترین مثال ہے۔ مصنف کے مطابق فصلوں کی کٹائی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ گاؤں کے تمام افراد بلاامتیاز ایک ایک کر کے سب کی فصلیں کاٹتے تھے۔ اس روایت کے باعث نہ صرف کام جلد مکمل ہو جاتا تھا بلکہ لوگوں کے درمیان محبت، یگانگت اور باہمی اعتماد بھی فروغ پاتا تھا۔

"گاؤں کی تمام فصلوں اور گھاس وغیرہ کی کٹائی اور گاہی لیتری کی صورت میں مشترکہ طور پر ہوتی تھی۔ فصلیں تیار ہوتے ہی گاؤں کے تمام افراد مل کر گاؤں کے ایک سرے سے ان کی کٹائی بلا تفریق شروع کرتے اور ہفتہ دس دنوں میں پورے گاؤں کی فصلوں کا صفایا کر دیتے تھے۔ کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی گاؤں کے وہ لوگ بھی جو پیشہ ہوتے یا کاروبار اور محنت مزدوری کرنے شہر گئے ہوتے؛ گاؤں پلٹ آتے اور لیتری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔"(۱۴)

اس اجتماعی نظام کی پابندی ہر فرد پر لازم تھی۔ جو شخص بلاوجہ اس روایت سے انحراف کرتا، اسے معاشرتی طور پر ناپسند کیا جاتا اور اس کی سماجی حیثیت متاثر ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں تہذیب صرف رسم و رواج کا نام نہیں تھی بلکہ اجتماعی ذمہ داری بھی اس کا بنیادی عنصر تھی۔

"لیتری سے غیر حاضری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور جو شخص بغیر کسی مجبوری کے مسلسل تین لیتریوں سے غائب ہوتا نہ صرف اس کی فصل کھڑی گلتی سڑتی رہتی بلکہ وہ گاؤں میں تنہا بھی رہ جاتا تھا۔"(۱۵)

مصنف اس روایت کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور اسے زرعی تہذیب کی قدیم روایت قرار دیتا ہے، جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ اس تہذیب کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انسان نے ذریعہ معاش میں زراعت کو ایجاد کیا ہوگا۔ اس تہذیب و رواج کا ذکر دنیا کی دیگر چند تہذیبوں میں بھی پایا جاتا تھا اور یہ نسل در نسل آگے منتقل ہوتا جاتا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم اس سراسر رضاکارانہ تنظیم کا آغاز کب ہوا۔ شاید زرعی دور کے آغاز ہی سے جب انسان نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے سکونت اختیار کی اور مل جل کر رہنا سیکھا تو اس نے ایک اجتماعی معاشرے کے قیام کے لیے اس رسم کو ایجاد کیا اور پھر نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی۔"(۱۶)

اس طرح ناول "جندر" میں زرعی تہذیب، اجتماعی تعاون، بزرگوں کا احترام، مذہبی رسوم، باہمی اخوت اور رضاکارانہ خدمت کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف ان روایات کو محض ماضی کی یادگار نہیں سمجھتا بلکہ انہیں ایسی تہذیبی اقدار قرار دیتا ہے جنہوں نے دیہی معاشرے کو صدیوں تک متحد اور مضبوط رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جدید مشینی دور ان روایات کو کمزور کرتا ہے تو دراصل ایک پوری تہذیب اپنے زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" محض ایک دیہی معاشرے کی داستان نہیں بلکہ ایک ایسی زوال پذیر تہذیب کا فکری اور فنی مرثیہ ہے جو صدیوں تک اجتماعی زندگی، باہمی تعاون، زرعی معیشت، خاندانی اقدار اور ثقافتی شناخت کی علامت رہی۔ ناول نگار نے جندر کو ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ جب معاشرے کی تہذیبی بنیادیں تبدیل ہوتی ہیں تو ان کے اثرات صرف معاشی یا سماجی سطح تک محدود نہیں رہتے بلکہ انسانی نفسیات، رشتوں، اقدار اور شناخت پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

اس مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ناول میں جندروئی تہذیب کے مختلف مظاہر نہایت فنی مہارت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ طبقاتی تقسیم، دیہی خوراک، لوک داستانوں کی روایت، خواتین کی سماجی حیثیت، تعلیم کے بارے میں قدیم تصورات، اجتماعی زرعی نظام (لیتری)، گھروں کی تعمیر میں باہمی تعاون، مذہبی و سماجی رسوم، خاندانی پیشوں کی روایت اور اجتماعی طرزِ زندگی اس تہذیب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مصنف نے ان تمام عناصر کو محض تاریخی واقعات کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ ثقافتی ورثے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ناول کا اہم پہلو یہ ہے کہ قدیم اور جدید تہذیب کا تصادم ایک فکری سوال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ٹریکٹر، تھریشر، بجلی سے چلنے والی آٹا مشین اور دیگر جدید ذرائع اگرچہ انسانی محنت کو آسان بناتے ہیں، لیکن ان کے نتیجے میں وہ سماجی روابط بھی کمزور ہو جاتے ہیں جو اجتماعی زندگی کی بنیاد تھے۔ پہلے لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے، مل کر فصلیں کاٹتے، گھر تعمیر کرتے اور اجتماعی ذمہ داریوں کو نبھاتے تھے، مگر مشینی دور نے انسان کو خود مختار تو بنایا، لیکن اسے اجتماعی زندگی سے بھی دور کر دیا۔ ناول کا مرکزی کردار ولی خان اس تہذیبی وابستگی کی سب سے مضبوط علامت ہے۔ اس کی شخصیت جندر کی آواز، آبائی پیشے اور اپنے ثقافتی ورثے سے اس قدر جڑی ہوئی ہے کہ وہ ان سے علیحدگی کو اپنی زندگی کے خاتمے کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس اس کا بیٹا راحیل جدید تعلیم اور جدید تہذیب کا نمائندہ ہے، جو اسی روایت کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ یوں ناول میں دو نسلوں کے فکری تصادم کے ذریعے تہذیبی تبدیلی کے اس عمل کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے آج کا معاشرہ بھی گزر رہا ہے۔

ناول کا اختتام اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ تہذیبیں صرف عمارتوں یا آلات کے ختم ہونے سے نہیں مرتیں بلکہ اس وقت زوال پذیر ہوتی ہیں جب ان سے وابستہ اقدار، روایات، طرزِ فکر اور انسانی تعلقات بھی معدوم ہونے لگتے ہیں۔ جندر کی خاموشی دراصل ایک پورے تہذیبی نظام کی خاموشی ہے، اور ولی خان کی تنہائی اس معاشرے کی تنہائی کی علامت بن جاتی ہے جو جدیدیت کی دوڑ میں اپنی ثقافتی شناخت کھوتا جا رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "جندر" اُردو ناول میں تہذیبی شعور کا ایک اہم اور منفرد نمونہ ہے۔ اختر رضا سلیمی نے نہ صرف ایک مخصوص خطے کی ثقافت، رسوم و رواج اور اجتماعی زندگی کو محفوظ کیا ہے بلکہ جدید معاشرے کو یہ احساس بھی

دلایا ہے کہ ترقی کی حقیقی روح اپنی تہذیبی شناخت، ثقافتی ورثے اور انسانی اقدار کے تحفظ میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "جندر" صرف ایک فرد یا ایک گاؤں کی کہانی نہیں بلکہ بدلتے ہوئے معاشرے اور مٹتی ہوئی تہذیب کا ایک مؤثر ادبی دستاویز ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد محمود سامٹیہ، خواب، اجتماعی لاشعور اور اختر رضا سلیمی، راولپنڈی، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشن، ۲۰۲۰ء، ص:۱۳۸

۲۔ ایضاً، ص:۱۴۵

۳۔ علی عباس حسینی، اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید، لی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص:۳۹

۴۔ ناز قادری، اُردو ناول کا سفر، مظفر پور، مکتبہ صدف، ۲۰۰۱، ص:۵۵-۵۴

۵۔ شفیق الرحمن، اُردو ناول میں تکنیک کے تجربات، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، ۲۰۱۳ء، ص:۱۳

۶۔ خالد محمود سامٹیہ، خواب، اجتماعی لاشعور اور اختر رضا سلیمی، راولپنڈی، رومیل ہاؤس آف پبلیکیشن، ۲۰۲۰ء، ص:۱۴۵

۷۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاؤس آف پبلیکیشن، ۲۰۱۷ء، ص:۱۱۰

۸۔ ایضاً، ص:۳۲

۹۔ ایضاً، ص:۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص:۴۲

۱۱۔ ایضاً، ص:۵۸

۱۲۔ ایضاً، ص:۵۹

۱۳۔ ایضاً، ص:۶۲-۶۱

۱۴۔ ایضاً، ص:۸۶

۱۵۔ ایضاً، ص:۹۶

۱۶۔ ایضاً

References in Roman script

1. Khalid Mahmood Samtia, Khwab, Ijtimai La Sha'oor aur Akhtar Raza Saleemi. Rawalpindi: Romail House of Publication, 2020, p. 138.
2. Ibid., p. 145.
3. Ali Abbas Husaini, Urdu Novel ki Tarikh aur Tanqeed. Aligarh: Educational Book House, 1987, p. 39.
4. Naaz Qadri, Urdu Novel ka Safar. Muzaffarpur: Maktaba Sadaf, 2001, pp. 54–55.
5. Shafeeq Rehman, Urdu Novel Mein Technique ke Tajribat. PhD Dissertation, 2013, p. 13.
6. Khalid Mahmood Samtia, Khwab, Ijtimai La Sha'oor aur Akhtar Raza Saleemi. Rawalpindi: Romail House of Publication, 2020, p. 145.
7. Akhtar Raza Saleemi, Jandar. Rawalpindi: Romail House of Publication, 2017, p. 110.
8. Ibid., p. 32.
9. Ibid., p. 38.
10. Ibid., p. 42.

11. Ibid., p. 58.
12. Ibid., p. 59.
13. Ibid., pp. 61–62.
14. Ibid., p. 86.
15. Ibid., p. 96.
16. Ibid.